بیسویں صدی کے جدید فکری اور تنقیدی رویے

ڈاکٹر صباحت مشتاق[1]

Abstract:

"Modernism is a major literary movement of the 20th century. There were many scholars who presented their concepts and theories like Ander Breton, Soren Kierkegaard, Baudelaire, Edgar Alan Poe, Jane Morse and Ferdinand Saussure. Their concepts and theories like Dadaism, Surrealism, Existentialism, Structuralism and De-structuralism influenced Art and Literature. They introduced and transformed the technique, form and style. The French, Russian revolution and Second World War played vital role to flourish them. Even after two centuriesn art and literature could not come out of their impacts."

مغرب میں سائنسی اور صنعتی ارتقا کی بدولت سائنسی طرز احساس نے بہت سے اوہام اورروایات کو توڑا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ لمحہ بہ لمحہ پیش آنے والی صورت حال اور نئے معاشرے کے تضادات بھی واضح ہونا شروع ہوگئے۔ یہ بات درست ہے کہ یہ ترقی جہاں ذہنی کشادگی ، وسعت نظری اور ذہنی بیداری لے کر آئی، یہ فکری تضادات بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک آتے آتے نو آبادیاتی نظام، اس کی کساد بازاری ، منڈیوں کے حصول اور تجارتی راستوں کی جنگ کے طور پر شدت اختیار کر گئےجس کا نتیجہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کی صورت میں نکلا۔ یہ جنگ جہاں مالی مفادات کا شاخسانہ ثابت ہوئی وہاں سماجی ، علمی اور ادبی حوالوں سے نئے فکری افق نمایاں ہوئے۔ پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں انسانی اقدار کی پامالی، زندگی پر بے اعتباری اور خون ریزی نے اہل علم کو نئے زوایے سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس جنگ کے خاتمے کے بعد مغرب میں بہت سے علمی اور ادبی فکری رویے رد عمل کے طور پر سامنے آئیں۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی کا ایک اور اہم حوالہ ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب تھاجو فرد کی انفرادیت سے ہٹ کر اس کی اجتماعیت کو سامنے لایا۔بیسوی صدی کی پہلی دو دہائیاں ایسے ہی کئی رویوں کو متعارف کرواتی ہیں۔لہٰذااس ادبی تناظر کو سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کے لیے ان پر سر سری نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد حالات و واقعات میں ہونے والی تبدیلی کے نتیجے میں جو ادبی اور فکری تحریکیں ابھریں ان میں اہم تحریک دادا ازم تھی۔ فروری ۱۹۱۶ء میں زیورچ سے شروع ہونے والی اس تحریک کے اثرات پیرس، برلن کے ساتھ پورے یورپ میں پھیل گئے۔ اس تحریک کا آغاز ٹرسٹان نے کیا۔ دادیت مصوری کا ایک مکتب فکر تھا۔ جو فطرت پسندی کے رد عمل کے طور پر سامنے آیا۔دادیت کا مقصد تمام اخلاقی اور ذوقی اقدار سے بغاوت اور ان کو تہہ و بالا کرنا تھا۔زارا کے علاوہ اس تحریک کے ساتھ وابستہ لوگوں میں" ہانس آرپ" "ہیو گوبال " رچرڈ ہیو لینسبیک" تھے۔ دادازم کے علمبردار یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ ادب کسی حد تک اپنی مردانہ خصوصیات سے عاری ہوچکاہے۔ انہیں اس بات پر بھی اعتراض تھا کہ بچے کے منہ سے پہلا لفظ "ماں"، امی کیوں نکلتا ہے۔ اصولاً اس کی زبان سے پہلے لفظ "ابا" نکلنا چاہیے۔ دادائیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ ادب کو مردانگی سکھائیں گے۔ اس تحریک کی ابتدا اس وقت ہوئی جب یورپ پہلی جنگ عظیم کی لپیٹ میں تھا۔میکانکی نظام نے فرد کا دائرہ کار محدود کر دیا تھااور دادازم کے بانی خود کو ادب و فن کے لیے وقف کیے ہوئے تھے۔ ان کے لیے کچھ مقدس نہ تھا۔ وہ نہ تو کمیونسٹ تھے اور نہ ہی انارکسٹ اور نہ صوفی۔ لہٰذا یہ تحریک مکمل طورپر اخلاقی اور مذہبی اقدار سے عاری تھی۔

---

[1]اسسٹنٹ پروفیسر،بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

“we spat upon everything including over selves”

دادازم کے منشور کا بنیادی لفظ تھا Nothingness۔دادائسٹ کسی پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھے۔(۱)

حتیٰ کہ ان کا کہنا تھا کہ جو صحیح دادائسٹ ہیں وہ خود بھی دادازم کے خلاف ہیں کیونکہ وہ ہر چیز جو کسی بھی اصول اور قانون کے تحت ہے اس سے انحراف ہی دادازم ہے۔دادائسٹ کے لایعنی نظریات کی وجہ سے اس کے پیرو کار وں میں بھی اس کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوگیااور وہ اس سے الگ ہوگئے اور ایک علیحدہ مکتبہ فکر کی بنیاد رکھنے کے بارے میں سوچنے لگے۔ دادازم چونکہ ادب، مصوری،فلسفہ اور موسیقی کی دنیا میں ہر چیز سے بغاوت تھی اور علامتیت کی حامل تھی اس لیے جلد ہی سریلزم میں ضم ہوگئی۔ سرریلزم دادازم کی ایک شاخ تھی۔ دادازم سے وابستہ شاعر اور ادیب بعد میں سرر یلزم سے وابستہ ہوگئے تھے۔ان میں آندرے برتیاں سرفہرست ہے۔۱۹۲۲ ء میں اندرے برتیاں نے دادازم کے مکتبۂ فکر سے علیحدگی اختیار کرلی۔ یہ تحریک فطرت کی عقلی اور روحانی قوتوں کے خلاف فن کی بغاوت اور نفس کی غیر عقلی قوتوں کا اعلانِ آزادی قرار پائی۔

> ’’یہ فقط دادایت کے رد عمل کے طور پر منظر عام پر نہیں آئی تھی بلکہ اس کے پس پشت فرائڈ کی لاشعور کی بصیرت ، ہیگل کے تصوراتی نظریات اور مارکس کے سیاسی افکار شامل تھے۔جن کا زمانہ دادایت سے پہلے کا ہے۔خصوصاً فرائڈ کا پیش کردہ نظریۂ لاشعور، انا، فوق الانا اور اصول حقیقت کا نظریہ اس تحریک کا سب سے بڑا محرک کہا جا سکتا ہے۔جس کے ذریعے انسان نے پہلی مرتبہ فوق الفطرت عناصر سے چھٹکارا پاکر لاشعور کے ذریعے اپنے وجود کی حقیقت اور زندگی کے آلام کے حل ڈھونڈنے کی کوشش کی۔‘‘(۲)

جب کہ ابو الا عجاز صدیقی کاسررریلزم کے بارے میں کہنا ہے:

> ’’تحت الشعوری اور خواب گوں تمثالیں پیش کرنے کی شعوری کوشش کا نام ہے۔جبکہ دادازم فن کی دنیا میں محض انارکی اور لاقانونیت کی حیثیت رکھتا ہے۔اس تحریک کو منفی آرٹ یا منافئی فن قرار دیا گیا ۔ جہاں تک شعر و ادب کا تعلق ہے دادازم کے علمبرداروں نے جو شاعری کی وہ نہ صرف غیر مربوط تھی بلکہ معنوی اعتبار سے بھی تہی دست تھی۔ اپنے نظریاتِ فن کے اعتبا ر سے یہ لوگ اس بے ربطی اور معنوی تہی دستی کے ہی مبلغ اور علم بردار تھے۔‘‘(۳)

سرریلزم نے چونکہ فرانس میں نشوونما پائی اس لیےانگلستان میں اس کے اثرات زیادہ مقبول نہ ہوئے البتہ جب دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء کے دوران بہت سے فرانسیسی سرریلسٹ امریکہ گئے تو وہاں کے ادب نے سرریلزم سے بخوبی فائدہ اٹھایا۔

جہاں تک اردو افسانے کا تعلق ہے اُس میں سرریلزم کے اثرات بہت واضح نظر نہیں آتے بلکہ صرف ایک زیریں لہر کے طور پر چلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ۱۹۳۵۔۱۹۳۰ میں جن افسانہ نگاروں کے ہاں اس کے اثرات نظر آتے ہیں ان میں سے بیشتر کو یورپ سے تعلیم حاصل کرنے اور مغربی ادب کے مطالعے کا موقع ملا جن میں احمد علی، رشید جہاں، سجاد ظہیر اور محمود الظفر قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے اردو افسانے کو نہ صرف مغرب میں پروان چڑھنے والے ادبی رجحانات اور تکنیکوں سے روشناس کرایا بلکہ نئے امکانات کو اردو افسانے میں سمونے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں اردو افسانہ شعور کی رو، آزاد تلازمۂ خیال، تاثریت، وجودیت، علامت اور سرریلزم سے آشنا ہوا۔ انگارے کے افسانوں میں خاص طور پر "مہاوٹوں کی رات" ، "بادل نہیں آتے" میں سرریلزم کی موجودگی کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ کرشن چندر کا مثبت اور منفی اور "ایک سرٹیلی تصویر"، عزیز احمد کے افسانے "جھوٹا خواب" میں سرریلزم کی لہر چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جدید لکھنے والوں میں انور سجاد کے افسانے "سنڈریلا"، "مرگی"، "کیکر"، نیّر مسعود کی کہانی "ندبہ" جبکہ احمد داؤد کی کہانیوں میں خاص طور پر"داستانِ شب رواں" سرریلزم کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ ان تمام افسانہ نگاروں کو باقاعدہ سرریلسٹ افسانہ نگار نہیں کہا جا سکتا مگر ان کے ہاں سرریلزم کے مدھم سہی مگر اثرات موجود ہیں۔

۱۹۳۹ء میں ہونے والی دوسری جنگ عظیم نہ صرف خونریزی کا باعث بنی بلکہ اس نے مغرب کے سیاسی نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔سماجی اقدار کی پامالی نے معاشرے کو مایوسی ، تنہائی اور غیر یقینی صورت حال سے دو چار کر دیا جس نے انسان کو اپنے داخل کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا۔ پروفیسر سی، اے قادر کے خیال میں:

''یہ وہ وقت تھا جب ہر طرف فرد کی فردیت پر حملے ہورہے تھے۔ انسان کو معروض بنا دیا گیا اور جبریت کا دور دورہ تھا۔مادیت اور مطلق تصوریت نے انسان کا دائرہ تنگ کر رکھا تھا اور اسے مقہور و مجبور زندگی دے رکھی تھی۔''(۴)

Dictionary of literary terms and theoriesکے مطابق وجودیت کے اصطلاحی معنی یہ بیان کیے جاتے ہیں:

"The term existentialism means Pertaining to existence or logic predicating existence philosophically, it now applies to a vision of the condition and existence of man his place and foundation in the world and his relationship, or lack of one, with God."(5)

وجودیت کی دو مختلف جہات ہیں۔ ایک مذہبی یا الٰہیاتی وجودیت۔جس کا نمائندہ کرکیگارڈ ہے جو خدا کی ذات میں اپنی بے چینی اور اضطراب کا حل تلاش کرتا ہے۔ کرکیگارڈ جن وجودی نظریات کا قائل تھا اردو جدید افسانے میں خالدہ حسین اور رشید امجد نے ان اثرات کو زیادہ قبول کیا۔خالدہ حسین کے ہاں فرد کا وجود مقدم ہے ۔ اُن کے ہاں اس بات کا گہرا احساس ملتا ہے کہ جدوجہدفرد کے وجود کا لازمی حصہ ہے جس سے وہ تکمیل ذات کے مرحلے سے گزرتا ہے ، وقت اور حالات کے سامنے ڈٹ جاتا ہے اور حالات کے تحت پیش آنے والی مشکلات سے نظر نہیں چراتا بلکہ ان کے سامنے ڈٹ جاتا ہے اور ایک خود اعتمادی اور رجائیت ان کے داخل سے جنم لیتی ہے۔ اُن کے ہاں خدا تخیلاتی سطح سے شخصی تصور میں ڈھلتا نظر آتا ہے جسے وہ پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ نہ صرف خدا کے ہونے کا اظہار کرتی ہیں بلکہ اپنی ذات کا استعارہ بھی اُس کے ساتھ جوڑتی ہیں۔

کچھ ایسی ہی صورتِ حال رشید امجد کے ہاں نظر آتی ہے ان کے ہاں ان کا خدا ہر وقت ان کے ساتھ موجود رہتا ہے اور وہ ہر لمحہ اس کا ہاتھ تھامے اُس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اگرچہ اُن کی کہانیوں میں بے بسی، تنہائی اور مرجانے کی خواہش بہت نمایاں ہے لیکن یہی چیزیں اُنہیں خدا کے قریب کرتی اور ان کے آپسی تعلق کو مضبوط کرتی ہیں۔ ان کے ہاں خدا کا تصور ڈراؤنا نہیں بلکہ ایک ساتھی کا سا ہے جو مذہبی وجودیت کا اصل چہرہ ہے۔ جدید علامتی افسانے میں قرۃ العین حیدر، رام لعل ، انتظار حسین، بلراج منیرا، انور سجاد، غلام الثقلین نقوی، عبداللہ حسین، منشا یاد وغیرہ کے ہاں وجودیت بہت نمایاں اور گہری ہے۔

اردو افسانے پر وجودیت کے اثرات کرکیگارڈ، سارٹر، کامیو اور اُن سے متاثرہ لوگوں کی تحریروں کے واسطے سے پڑے مگر ان اثرات نے جدید اردو افسانے میں نہ صرف موضوع کی گہرائی پیدا کی بلکہ انوکھی علامتوں، استعاروں اور تشبیہات سے افسانے کو نیا رنگ دیا جو ہمیں انتظار حسین کے افسانے "زردکتا"، "آخری آدمی"، قرۃ العین حید ر "جلا وطن"، "رام لعل"، "آنگن"، "قبر"، انور سجاد "گائے"، "کونپل"،"پرندے کی کہانی"، خالدہ حسین "سواری"، "ایک بوند لہو"، ''عبداللہ حسین "ندی"، منشا یاد"کنواں چل رہا ہے"میں واضح نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ سمیع آہوجہ، زاہدہ حنا، مرزا حامد بیگ، احمد داؤد، احمد جاوید، مسعود اشعر، مظہر الاسلام نے وجودی فکر کو جدید اُردو افسانے میں پروان چڑھایا جبکہ دوسرا رنگ دہری یا لادینی وجودیت کا ہے جس کی نمائندگی سارتر کرتا ہے۔اس کے نزدیک انسان ایک فعال اور متحرک ہستی ہے۔

وجودیت کا اصل بانی کرکیگارڈ تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی کتابیں اور اس کے نظریات ہی اس کا منبع ہیں۔اس کا کہنا تھا:

"Subjectivity is Truth, Subjectivity is reality."(6)

سارتر نے اپنی تحریروں کے ذریعے وجودی مسائل اور سوالات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی مثلاً وجود کو جوہر پر فوقیت دینا، بے معنویت ،متلی اور لایعینیت کے احساس کو بیان کرنا۔کرب، مایوسی،بے زاری،احساسِ جرم تنہائی اور دہشت کے پہلوؤں کو ابھارنا، کوئی فیصلہ کرتے ہوئے ذہنی کشمکش سے دوچار رہنا، ریا کاری پر مبنی زندگی سے نفرت کا اظہار، انتہائی یاسیت، قنوطیت اور بحرانی صورت حال سے ابھرنے والی رجائیت یا زندگی کا عرفان پائی ہوئی رجائیت کو گرفت میں لینا اور رومانی اکتشافات سے منسلک کیفیات کا اظہار کرنا۔ لا دینی یا دہری وجودیت (جس کی نمائندگی سارتر کرتا ہے) کے مطابق وجود جوہر پر مقدم ہے۔اس کا کہنا ہے کہ" میں ہوں، اس لیے میں سوچتا ہوں"، وہ انسان کو کوئی شے نہیں بلکہ متحرک ہستی ، ایک فعلیت قرار دیتا ہے:

''جس دہری وجودیت کا میں نمائندہ ہوں ،وہ زیادہ استقامت کے ساتھ اعلان کرتی ہےکہ اگر خدا موجودنہیں توبھی کم از کم ایک ہستی ایسی ضرور ہے جس کا وجود اس کے جوہرپر مقدم ہے۔ یعنی ایک ایسی ہستی جو اپنے تصور سے پہلے موجود ہوتی ہے۔ یہ ہستی انسان ہے۔''(۷)

بقول نیر مسعود :

''اردو ادب پر وجودیت کا اثر کامیو،سارتر اور اور ان سے متاثرہ دوسرے ادیبوں کی تحریروں اور تخلیقات کے واسطے سے پڑا ہے۔''(۸)

اگر فارم(formٌ) کے تجربے بالکل بند ہو جائیں تو ادب اور فن جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔ وجودیت اور سریلزم نے ادب اور فن میں نہ صرف موضوع کی گہرائی پیدا کی بلکہ انوکھی علامتوں، استعاروں اور تشبیہات سے معنی کی ایک نئی دنیا پیدا کی ۔ علامت نگاری (symbolism) دراصل رومانویت اور حقیقت پسندی کے ردعمل کے طور پر آئی۔ اسی دور میں ڈارون نے انسانی ارتقا کا نظریہ پیش کر کے انسانیت کی بنیادیں ہلا دیں۔ اسی کے ساتھ مشینی انقلاب نے انسان کو بے بس کیا تو علامت نگاری پروان چڑھنے لگی۔

جین مورس نے علامت نگاری کے جس سکول کی بنیاد رکھی اس کے نمایاں ناموں میں بودلئیر، ملارمے،ورلین اور ریمبو شامل تھے۔ جب کہ اس کی پیروی کرنے والوں میں رینے گل، سٹیورٹ میرل، گستاف اور فرانس گرفن شامل تھے۔علامت نگاروں نے بار بار اس امر کا اظہار کیا کہ انہیں زندگی سے کوئی سروکار نہیں صرف فن اور خواب کی دنیا ہی ان کی کل کائنات ہے۔ انہیں سماج سے کوئی واسطہ نہیں صرف تخیل کی دنیا ہی ان کے لیے سب کچھ ہے۔ ان کے نزدیک حقیقت صرف سایہ اور دنیا ایک مٹی کا تودہ تھی۔ علامت نگاری ان کے ذہنوں نمائندگی کرتی ہے،جو ہر لمحہ نئی چیزوں کی تلاش کرتے ہیں ،کہنگی سے نفرت اور بغاوت کرتے ہیں، علامت ایک اعتبار سے معنی کی دریافت اور یاددہانی کا ذریعہ ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے خیال میں:

''علامت عکاسی کا نہیں دریافت اور قلب ماہیت کا عمل ہے۔ یہ کسی مرتب شدہ صورت حال کو سامنے نہیں لاتی بلکہ امکانات کو مس کرتی ہے تاکہ حقیقت کی پر اسراریت کو جان سکے۔ علامت تو ہر دم پھیلتی شعاعوں کا دوسرا نام ہےیہ شعاعیں دراصل وہ Tentacles ہیں جو حقیقت کے بطون میں اتر کر اس کے امکانات کو مس کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ان کا یہ کام نہیں کہ محض دریافت شدہ حقیقت کو جھاڑ پونچھ کر پیش کردیں۔''(۹)

علامت نگاری دیو مالا سے مختلف چیز ہے۔ دیو مالا کے کردار علامتی انداز میں استعمال کیے جا سکتے ہیں مگر جس قسم کی علامت کے لیے تخلیق کیے جاتے ہیں انہیں بدلا نہیں جا سکتا ۔ جب کہ علامت نگاری میں ایک ہی چیز مختلف چیزوں کی علامت ہوسکتی ہے۔ علامت جب مانوس اور مقبول ہو جاتی ہے تو پھر وہ کبھی ختم نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے معنی ختم ہوتے ہیں بلکہ وہ ہمیشہ کے لیے معنی خیز ہوتی ہے۔ علامت نگاری کی اس تحریک کا دائرۂ اثر صرف فرانس تک ہی محدود نہ رہا بلکہ فرانس سے باہر بھی خاص طور پر روسی ناول نگاروں نے اس کے اثرات قبول کیے۔ علامت دراصل اس وقت جنم لیتی ہے جب اظہار پر پابندی لگا دی جائے۔پاکستان میں ۱۹۵۸ء کے پہلے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد۱۹۶۰ء کی دہائی میں علامت نگاری کا رجحان واضح ہونا شروع ہوا۔اس کے علاوہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ہی نظریات اور تصورات کو رد کرکے

حقائق کو نئے زوایوں سے پر کھنے کا علمی رویہ وجود میں آگیا تھا۔ لہٰذا ادب میں بھی نئے راستوں کی تلاش کا رحجان فروغ پانے لگا۔۱۹۶۰ء کے بعد اردو افسانے نے جو انداز اختیار کیا اُسے جدیدیت کا نام دیا گیا۔ ملک کے سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی حالات میں جو تبدیلیاں آئیں انھوں نے فرد کی خارجی زندگی میں تو کوئی انقلاب پیدا نہیں کیا مگر اُس کے ذہن اور فکری ڈھانچے کو ضرور بدل دیا۔ جدید افسانہ اسی بکھرے ہوئے انسان کے وجود کے نمونے پیش کرتا ہے۔ اس زمانے میں جہاں اسلوب کی سطح پر اہم تبدیلیاں ہوئیں وہاں علامت اور تجرید افسانے کا حصہ بنی۔ اگرچہ جدید افسانے سے قبل روایتی افسانے میں ہمیں علامت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں جیسے کہ پریم چند کی کہانی "شطرنج کی بازی"، "دو بیلوں کی کہانی"، احمد علی کی "ہماری گلی" اور"قید خانہ" افسانہ ہے مگر ہمارے ہاں علامت کا غالب رجحان ۱۹۶۰ء کے بعد مروج ہوا۔ نئی علامتیں ، علامتی کردار ، استعارے، تمثیل، غیر مرکب پلاٹ اور کلیدی جملوں کی تکرار کے تجربات نے اردو افسانے کو قاری کے لیے موضوع بحث بنا دیا۔ انتظار حسین، بلراج منرا، جوگیندر پال، سریندر پرکاش، انور سجاد اور رشید امجد نے بہت سے علاماتی افسانے لکھے۔ انتظار حسین نے علامت کو استعمال کرتے ہوئے داستانوی اسلوب اختیار کیا جبکہ رشید امجد نے تجریدی انداز۔ جوگیندر پال اور مسعود اشعر بھی تجریدی انداز اپنانے والوں میں ہیں جبکہ نیّر مسعود کے ہاں علامت، تجرید کے ساتھ داستانوی انداز موجود ہے۔ لکھنے والوں کے اس انداز سے کہانی میں افسانویت کا فقدان ہو گیا۔ وحدت کا عنصر غائب ہوا اور انتشار ہی انتشار رہ گیا۔ علامت کا استعمال واقعات کو مزید بامعنی بنانے کے لیے کیا جاتا ہے اور جن لوگوں نے اسلوبیاتی سطح پر اسے استعمال کیا انھوں نے نہ صرف معنی و مفہوم کی لے برقرار رکھی بلکہ اُن کی تحریروں میں گہرائی اور معنویت پیدا ہو گئی جن میں انتظار حسین کا نام سب سے نمایاں ہے جنھوں نے اپنے کرداروں کی تشکیل، علامتوں، حکایتوں اور اساطیری کرداروں سے کی۔ ان کے علاوہ انور سجاد، بلراج منرا، احمد ہمیش وغیرہ نے ایسی کہانیاں لکھیں جن کا پورا نظام علامتی نہیں بلکہ انھوں نے چند علامتوں کو استعمال کر کے علامتی انداز اختیار کرنے کی کوشش کی اور کہانی سے وابستہ روایتی شرائط سے انحراف کے ساتھ ساتھ وحدت زمان و مکان کو بھی قائم رکھتے ہوئے افسانے کو بالکل نئے پیرائے سے مرتب کیا۔

علامتی افسانے کی سب سے اہم خوبی اسلوب کی تازگی ہے۔ اس نے اسلوب کی سطح کواکہرے پن سے نجات دلا کر جملوں کی روایتی ساخت کو توڑا جس سے افسانے میں نہ صرف فکری تہ داری پیدا ہوئی بلکہ مواد ، اسلوب اور ٹکنیک کے اعتبار سے بھی اردو افسانے میں وسعت آئی ۔ علامت نگاری اردو ادب کی ایک اہم تحریک تھی۔ یہ ادب میں کسی نہ کسی صورت میں موجود رہی اور آج تک چلتی رہی۔

بیسویں صدی کے آغاز میں فکری سطح پر دو مختلف دھارے نظر آتے ہیں۔ ایک مغربی تحریکوں اور ان کے اثرات کا دوسرا برصغیر میں اٹھنے والی ادبی تحریکوں کا۔مغرب میں صنعتی انقلاب اور سائنسی ترقی اگرچہ بہت سی فرسودہ روایات کے خاتمے کا سبب بنی لیکن تبدیلیوں کے تضادات بھی سامنے آنے لگے۔ مغرب میں علمی و ادبی سطح پر یہ زمانہ قابل ذکر ہے۔ دادازم، سریلزم، وجودیت اور علامت نگاری کی تحریکوں نے اپنے عہد کی بے چہرگی ، اقدار کی پامالی اور فرد کی تنہائی کو تخلیقی سطح پر محسوس کیا۔ اس کے علاوہ ادب، نفسیات کے تعلق اور لسانی سطح پر جدید تحریکوں کے فکری مباحث بھی اپنا اثر دکھانے لگے اور اس طرح ادب میں بھی فکری راہیں کشادہ ہوتی چلیں گئیں۔

جدید لسانی مباحث میں ساختیات، پس ساختیات اور رد تشکیل کا آغاز ہوا۔ ساختیات کا آغاز بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے ہوتا ہے۔ یہ باقاعدہ کوئی تحر یک نہیں ہے بلکہ ایک طرز مطالعہ ہے۔ اس کے بنیادی اصول سوئیسر(Ferdinandda Saussureکے لسانی افکار پر مبنی ہیں۔سوئیسر نے زبان کا مطالعہ نشانات (signs)کے طور پرکیا جو کسی بھی زبان کی بنیادی اکائی یعنی بولا گیا لفظ ہے۔ نشان کو بھی دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے پہلاsignifire اورsignified سوئیسر زبان کو بھی دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے ایک لانگ (langue) اور دوسرا(parol)۔

سوئیسر کے لسانی افکار ساختیات کو بنیادیں فراہم کرتے ہیں اور بعد میں آنے والی تبدیلیوں میں ان کا بہت اہم کردار نظر آتا ہے۔ پس ساختیاتی فکر رولا بارتھ، لاکان، اور فوکو کے ہاں ہمیں ساختیات کا دائرہ وسیع ہوتا دکھائی دیتا ہے جس میں رد تشکیل کو خاص اہمیت حاصل ہے لیکن رد تشکیل سے سب سے زیادہ گزندساختیاتی نظریات کو پہنچتی ہے کیونکہ ساختیات ایک مربوط نظام کا نام ہے۔ جب کہ رد تشکیل کسی بھی نظام کے وجود کو ماننے سے انکار کرتی ہے۔

رد تشکیل کا پہلا اعتراض سوئیسر نے نشانات کے نظام پر کیا ۔ ردتشکیل کےقائل ایک اور مفکر دریدا کے نزدیک'' زبان محض افتراق کے اور کچھ بھی نہیں''(۱۰)کیونکہ یہ نشان بھی معنویت کی وضاحت کے لیے کسی اور نشان کا محتاج ہے۔ رد تشکیل ایک باغیانہ اور پیچیدہ طریقہ ہے جو اپنی مخصوص اصطلاحات کے ذریعے متن کا مطالعہ کرتا ہے۔۱۹۸۰ء کی دہائی میں ساختیات اور پس ساختیات کی بحثیں ادب کا حصہ بنتی ہیں اور ادب کو نئی تبدیلی سے دوچار کر تی ہیں۔ اب تک ادب اور فنون میں موضوعات، اسلوب، ہیئت میں جو تبدیلی ہوتی رہیں خاص طور پر بیسیویں صدی میں وہ انقلابی تبدیلیاں ثابت ہوئیں جن کے اثرات کوادب اورفن میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

حوالہ جات

1. Dada and Surrealism, by Bigsby, London, 1972, p.5
2. ناظم،جر من افسانہ اور اس کا ارتقا،مشمولہ نقوش، لاہور:شمارہ۲، ۱۹۶۵ء،ص۱۷۳
3. ابو الاعجاز صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات،اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۷،ص۷۷
4. پروفیسر سی۔اے قادر، فلسفۂ جدید اور اس کے دبستان، لاہور:مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۱۹۸۱،ص۱۱۸
5. Dictionary of Literary Terms and Literary Theory, by, A.J Guddon, Penguin Book, London, p.936
6. Soren Kierkegaard concluding unscientific Postscripts, Tr David, Swensons, Lillion M Arvin Swenson and Walter Lowrie, Princeton, Newjersy, 1941, p183
7. نیر مسعود، وجودیت اور نیا ادب(مضمون)مشمولہ، دائرے ،شمارہ ۳،علی گڑھ:ایجو کیشنل بک ہاؤس، س۔ن، ص۵۶
8. ژاں پال سارتر، وجودیت اور انسانی دوستی(مترجم) قاضی جاوید، لاہور:روہتاس بک سیریز،۱۹۹۱،ص۱۶
9. وزیر آغا ، دائرے اور لکیریں ،لاہور:مکتبہ فکرو خیال، ۱۹۸۶،ص۱۳۲
10. گوپی چند نارنگ ،ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات ،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۳